آزادی بیان کی فکری اور نظریاتی بنیادیں

ڈاکٹر محمد حسین مظفری

ایسا لگتا ہے کہ عصر حاضر میں اور خصوصاً موجودہ حالات میں اب یہ ممکن نہیں رہ گیا ہے کہ گذشتہ افکار و مفاہیم پر مبنی آزادی بیان سے وابستہ اصولوں اور معیاروں کے سایہ میں آزادی بیان کی ضمانت فراہم کی جاسکے۔ حیرت انگیز اقتصادی ترقی، فنی ترقی و وسعت اور وسائل ارتباطات کے غیر معمولی پھیلاؤ کے سامنے انسانی حقوق کے بین الاقوامی چارٹر میں مذکور وموجود اصول وقوانین اور ضمانتیں اب فرسودگی اور کہنگی کا شکار ہوچکی ہیں، اور اب ان میں کوئی خاص اثر باقی نہیں رہ گیا ہے۔

ان مفاہیم کا تعلق اس دور سے ہے جب سیاسی افکار وعقائد کو بیان کرنے کے لئے شہر کے بڑے میدانوں اور مقدس مذہبی مقامات پر منعقد عام اجتماعات میں ہونے والی تقریروں سے کام لیا جاتا تھا۔ مصنوعی سیاروں کی سہولتوں (Sattelite Facility) کے غیر معمولی فروغ اور انٹرنیٹ کے عام ہوجانے کے بعد براہ راست تعلقات اور روبرو گفتگو کی اہمیت گھٹ گئی ہے۔ واضح رہے کہ اجتماعی ارتباط کے وسائل وامکانات تمام شہریوں کو یکساں طور پر حاصل نہ ہوں گے اور ارتباطی تکنیک بھی محض کچھ کمپنیوں پر منحصر دکھائی دے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آزادی بیان اپنے گذشتہ معنی ومفہوم کے ساتھ سبھی لوگوں کے لئے فراہم نہ ہوگی۔

یہ صورت حال فقط کسی مخصوص ملت ومملکت کے رہنے والوں تک محدود نہیں رہ جاتی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بڑی بڑی مواصلاتی اور اطلاعاتی کمپنیاں عالمی ارتباطات کو چنگل میں لیکر اپنے جادوئی وسائل اور سحر آمیز طریقوں سے اپنے نظریات اور مطالبات کو دنیا کے دورترین علاقوں تک منتقل کرسکتی ہیں اور عالمی رائے عامہ کو اپنے مفاد ومصالح کے لئے ہموار کرسکتی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ مصرف پسندی (Consumerism) پر مبنی موجودہ ثقافت میں عام شہری جمہوری ذہنیت کے حامل نہیں ہیں لہٰذا ایسی صورت میں یہ کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ آزادی بیان معیاری کیفیت کی حامل ہوگی؟

پس آزادی بیان کے روایتی اصولوں کی بنیاد پر وہ عمومی افکار اور رائے عامہ جن کو مختلف افکار

وعقائد کے درمیان موجود رقابت کے سایہ میں پروان چڑھنا چاہئے، ایسی تنظیموں اور اداروں کے چنگل میں گرفتار دکھائی دیتی ہے جن کے پاس یہ جادو کی ٹوکری موجود ہے۔ پس لوگ افکار وعقائد کے بازار میں مختلف النوع خیالات سے روبرو نہیں ہیں کہ ان کے درمیان موجود آزاد انہ رقابت کے ذریعہ درست اور حق پر مبنی خیالات پر دسترس حاصل کرتے ہوئے اس کا تجزیہ کرسکیں۔ افکار وعقائد کے درمیان آزادانہ رقابت اور افکار کی پیشکش کا حقیقی مفہوم اسی وقت ذہن میں آسکتا ہے جب تمام لوگوں کو اپنے افکار وعقائد کے بیان کے لئے یکساں مواقعہ حاصل ہوں اور جدید مواقعہ دے کر انہیں بھی دیگر لوگوں کی طرح مساوی دسترس فراہم کی گئی ہوتا کہ بوقت ضرورت یہ لوگ بھی اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں۔

لیکن ایسے حالات میں جبکہ لوگوں کے اقوال وبیانات کو ساری دنیا تک پہونچا نے والی تنظیمیں جملہ وسائل وامکانات پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہیں اور ان وسائل کے ذریعہ ان اداروں نے عالمی رائے عامہ کو بھی اپنے مفاد میں ہموار کرلیا ہے،مختلف آزاد افکار وعقائد کے درمیان رقابت کی بات بالکل بے معنی وبے مفہوم ہوکر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا روایتی مفاہیم کی بنیاد پر تشکیل شدہ آزادی بیان سے جڑے ہوئے اصول وقوانین عام شہریوں کے لئے آزادی بیان کی سہولت کی ضمانت نہیں فراہم کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ قوانین ابلاغ عامہ سے وابستہ تنظیموں اور اداروں کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور عام لوگوں کے لئے یہ ایک امر محال ہے کہ وہ ان عظیم اداروں تک رسائی حاصل کرسکیں یا ان عظیم تنظیموں کی رقابت میں اپنے افکار وعقائد پیش کرسکیں۔

اس مقالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آزادی بیان کے سلسلہ میں موجود روایتی اصول وقوانین موجودہ حالات میں کارآمد نہیں ہوسکتے اور ان حالات میں جن ضمانتوں کی پیشین گوئی کی گئی ہے وہ فقط ابلاغ عامہ سے جڑی ہوئی عظیم تنظیموں کے حق میں مفید وموثر ثابت ہوں گی، جبکہ زیادہ تر عام شہریوں کو یہ توفیق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے حقوق کو حاصل کرسکیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان روایتی قوانین میں ان لوگوں کے حقوق کی حمایت میں کسی چیز کی طرف ہلکا سا کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے اور حملہ آور امواج نے ان کی زندگی کی مکمل سلامتی اور فکری وروحانی سکون کو اپنا نشانہ بنارکھا ہے۔

دوسری طرف دیگر اہم مسائل پر غوروفکر لازمی معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے

خیالات کا اظہار کرے؟ یا یہ بہتر ہے کہ لغو وبیہودہ خیال کے حامل افراد خاموش رہیں اور فقط اہم پیغام والوں کو اظہار خیال کا موقع فراہم کیا جائے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ حکومت جس طرح اقتصادی امور میں آزادانہ مداخلت کرتی ہے اسی طرح افکار وعقائد کے اس بازار میں بھی اسے مکمل مداخلت کی آزادی حاصل ہو؟

آزادی بیان کی جدید توجیہ:

دور جدید سے قبل آزادی بیان کے سلسلہ میں حکام نے سنجیدہ پابندیاں عائد کررکھی تھیں اور ان پابندیوں کی یہ توجیہ بیان کی جاتی تھی کہ جھوٹی اور بے بنیاد اطلاع عوام کی گمراہی کا باعث ہوسکتی ہے وہ حق وحقیقت تک رسائی حاصل نہ کرنے سے محروم ہوجاتے ہیں۔ چرچ نے اس مقصد کے لئے ایک مستقل عدالتی ادارہ قائم کردیا جس کی ذمہ داری تھی کہ وہ تحقیقاتی اور احتسابی کارروائی کے ذریعہ اس قسم کی باتوں کو فوری طور پر ختم کردے اور اسے ہرگز فروغ حاصل نہ ہونے پائے۔ یہ ادارہ مختلف یورپی ممالک میں پوری طرح سرگرم عمل رہا اور خصوصی طور پر ان ملکوں میں اس ادارہ کی کارکردگی اچھی رہی جہاں سماجی حکمراں طبقہ کی طرف سے اس ادارہ کی خاطر خواہ حمایت کی گئی۔ اکثر کہاجاتا ہے کہ Giordano Bruno وہ آخری شخص تھا جس کو ۱۶۰۰ء میں روم سے حاصل شدہ احکام کے بموجب بدعتی یا مسلمہ عقائد کے خلاف کوپرنیکانیسکی افکار وعقائد رکھنے کی وجہ سے زندہ جلا دیا گیا تھا۔ اسی زمانہ میں پرنٹنگ پریس کی ایجاد ہوئی اور دیکھتے دیکھتے اسے غیرمعمولی فروغ بھی حاصل ہوگیا اور پریس کی ترقی کی وجہ سے چرچ اختلاف واحتجاج کی آواز کو دبانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ مارٹن لوتھر نے اس نظام کے خلاف کامیاب جدوجہد کی اور Protestant نامی اصلاحی جماعت کی تشکیل میں کامیاب ہوگئے۔

مغربی یورپ میں سیاسی آزادی کی جدوجہد میں ''آزادی بیان کی جدوجہد'' کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ انگریزی زبان کے مشہور شاعر جان ملٹن نے پریس کی آزادی کا دفاع کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ پریس کی آزادی انسانی زندگی کے لئے اتنی ہی لازمی ہے جتنی ملک وملت کی ترقی اور حق کی تلاش وجستجو۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ کسی کو حق کی رسائی اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک وہ تمام افکار وعقائد کا باقاعدہ تجزیہ نہیں کرتا۔ اس کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ تجزیہ کے دوران اسے

حق کے انتخاب و اختیار کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ سچائی کھلے مقابلہ میں جھوٹ پر مکمل غلبہ حاصل کرے گی۔

آزادی بیان کو ایک لمبی مدت سے ایک بنیادی حق کی حیثیت حاصل رہی ہے اور دیگر حقوق کے حصول واستعمال کا دارومدار بھی اسی حق پر رہا ہے۔ تاریخی بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جیمس مِل (James Mill) اور ان کے فرزند جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) دونوں نے آزاد پریس اور رعایہ یا عوام الناس کے سلسلہ میں حکومت کو متوجہ رکھنے میں اس کی اہمیت وافادیت اور ظلم وناانصافی کی روک تھام میں پریس کے اہم اور موثر کردار کے سلسلہ میں اپنے مقالات لکھے۔ بعد میں لکھے گئے اپنے ایک مقالہ میں جس کا عنوان ''آزادی'' تھا، جان نے آزادی کے سوال پر تفصیلی بحث کی اور اپنی گفتگو کو محض پریس کی آزادی تک ہی محدود نہیں رکھا۔ انہوں نے ہر طرح کی اطلاع اور ہر قسم کے مخالف وموافق بیانات اور مخالف افکار وعقائد حتی جھوٹے بیانات پر بھی توجہ دینے کی بات کہی۔

جان ایس مل نے ''خیالات کے بازار'' کا تصور پیش کرتے ہوئے لوگوں کی انفرادی آزادی فکر پر کم سے کم پابندی کی بات کہی۔ بازاری اقتصاد میں مختلف النوع چیزیں خریداروں کے سامنے پیش کی جاتی ہیں اور لوگوں کو سب سے اچھے سامان کی خریداری کی سہولت فراہم ہوا کرتی ہے اور کم اچھا اور گھٹیا قسم کا سامان بازار خود ہی رد کردیا کرتا ہے۔ اسی طرح افکار و خیالات کے بازار میں بھی خیالات کے درمیان مقابلہ کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے۔ آخر کار سچائی کو تمام جھوٹے اور بے بنیاد خیالات پر فاتح کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آنا ہے۔ لوگ خود بخود برے یا معیاری اعتبار سے کمتر خیالات کو رد کردیں گے۔ دنیائے بشریت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ صحت مند، انسانیت دوست اور حقیقی تخلیقی افکار وعقائد کو اپنی آئندہ نسل کے حوالے کرے۔

انہوں نے آزادی فکر کی حمایت میں اپنے بیان کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے فرمایا: اب ہم لوگوں کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہے کہ انسان کے لئے ذہنی صحت وسلامتی کتنی ضروری ہے اور انسان کی جملہ فلاح وبہبود کا انحصار ذہنی سلامتی پر ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح آزادی فکر اور فکر کے بیان کی آزادی کا مسئلہ ہے جس کی تشریح درج ذیل چار مختلف بنیادوں پر کی جاسکتی ہے:

سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ اگر کسی آزاد خیال کو زبردستی خاموش کردیا جاتا ہے تو اس میں اس بات کا امکان بھی ہوتا ہے کہ کچھ باتیں حق وحقیقت پر مبنی ہوں اور اگر ہم اس خیال کی تردید کرتے ہیں تو ہمیں اپنی معصومیت کا اعتراف کرلینا چاہئے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ جس آزاد خیال کو خاموش کردیا گیا ہے، وہ غلط تو ہوسکتا ہے لیکن ایسا بھی ممکن ہے اور اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ اس پورے بیان کا کچھ حصہ حق وصداقت پر مبنی ہو۔ اور بالعموم یہی ہوتا ہے کہ کوئی بھی عام بیان چاہے وہ کسی موضوع پر ہو، ہمیشہ صددرصد سچائی کا حامل نہیں ہوتا ہے۔ درحقیقت برے افکار وعقائد کے درمیان ٹکراؤ کی صورت میں جو چیز باقی رہ جاتی ہے وہ کبھی کبھی ابھر کرسامنے آجاتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ حاصل شدہ فکرکو سچی ہی نہیں بلکہ بالکل سچی ہوکہنے دیجئے۔ جب تک اس بیان کی مکمل تصدیق نہ ہوجائے زیادہ تر لوگ اس کو بینش داوری کانام دیں گے اور اس کے حقیقی مفہوم میں بھی شک وتردید سے کام لیں گے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ چوتھی بات یہ ہے کہ بنیادی اصول کا مفہوم بھی خطرہ میں پڑجائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھ لیجئے کہ یا تو بنیادی اصول کا اصل مفہوم پوری طرح نابود ہوجائے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو اس میں کمزوری کا پیدا ہوجانا یقینی ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگوں کے کردارو اخلاق پر اس کا جواثر مرتب ہونے والا ہے وہ بالکل ختم ہوجائے گا۔ کلیسا کے مقررہ عقائد صرف پیشہ ورانہ، نیک امور میں بالکل غیر موثر ہوجائیں گے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسکی وجہ سے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے اور ذاتی تجربہ ومنطقی دلائل کے نتیجہ میں ابھرنے والے حقیقی افکار وعقائد کے فروغ میں بھی رکاوٹ کا پیدا ہونا کسی حدتک یقینی ہے۔[1]

موجودہ حکومت کامشن:

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ موجودہ حکومت ماورائی حقیقت اور اپنے شہریوں کی نجات وبہبودی کے سلسلہ میں کوئی جدوجہد نہیں کرتی ہے۔ اکثر غیر جانبداری کے بہانہ وہ ایسے امور ومعاملات کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتی جس کا تعلق انسانی وجود، اصل مقصد اور اخلاق سے ہوا کرتا ہے۔

1.Asian Age, International News, New Delhi, May 3,2006, page.8.

درحقیقت آزادی کے حق کے استعمال کے سلسلہ میں پہلی اور اہم پابندی دوسرے لوگوں کی مختلف النوع آزادی اور حقوق ہیں۔ اس موقع پر یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ آزادی کا عدل وانصاف سے گہرا تعلق ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دونوں کے درمیان ایک منطقی توازن قائم رکھنے میں غیر معمولی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جدید نظریہ بعض سیاسی اور مدنی حقوق کے سلسلہ میں حکومتی مشن کے دائرہ اختیار میں کمی پیدا کردیتا ہے۔

آزادی کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ ہر فرد کو اپنی خواہش کے مطابق کسی کام کو انجام دینے یا انجام نہ دینے میں اپنی صلاحیت کے استعمال کا حق حاصل ہو بشرطیکہ اس کے عمل سے دوسرے کے حقوق پامال نہ ہورہے ہوں اور قانون نے جو حدود قائم کی ہیں ان کی خلاف ورزی بھی نہ ہوتی ہو۔ نامور فلاسفہ اور ماہرین علم ودانش نے آزادی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی مکمل نشاندہی کردی ہے۔ مثبت آزادی کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ فرد کو اپنی صلاحیت کو عملی جامہ پہنانے کا مکمل حق حاصل ہونا چاہئے۔ بالکل اسی طرح منفی آزادی کی تعریف میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی فرد یا شخص کی راہ میں کوئی کسی قسم کی رکاوٹ نہ پائی جاتی ہو۔ بعنوان مثال تھومس ہوبس (Thomas Hobbes) کے مطابق فرد واحد اس کام کو کرنے کے لئے آزاد ہو جس کو انجام دینے میں کوئی قانونی خلاف ورزی نہ پائی جاتی ہو۔ اس کے علاوہ وہ دیگر مسائل کے سلسلہ میں پوری طرح خاموش دکھائی دیتے ہیں۔ منفی آزادی کے سلسلہ میں موجود فلسفیانہ خیال فرد واحد کی اس انفرادی آزادی کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس پر دوسروں کی حاکمیت پائی جاتی ہو۔ اس منفی خیال کے بموجب ایک شخص اس حدتک آزاد تسلیم کیا جاتا ہے جس حدتک کوئی شخص اس کے کام میں مداخلت نہیں کرتا۔

''منفی آزادی'' اور مثبت آزادی'' کے درمیان Isaiah Berlin نے اپنے'' آزادی کے دو بنیادی خیالات'' نامی مقالہ میں باقاعدہ خط فاصل قائم کردیا ہے۔ انکا خیال ہے کہ سیاسی روایت میں یہ فرق وامتیاز کافی گہرا ہے۔ منفی آزادی کا تصور درحقیقت برطانیہ کے سیاسی فلاسفہ مثلاً Hobbes، Locke اور Mill سے وابستہ رہا ہے جبکہ مثبت آزادی کے تصور کی وابستگی ہیگل، روسو، ہرڈر اور مارکس جیسے یوروپی دانشوروں سے تھی۔

مابعد جدیدیت راہ وروش:

درحقیقت ''بازارچۂ افکار'' کا تصور پیش کرنے والے دانشوروں کا سب سے اہم خدشہ یہ رہا ہے کہ گمراہی پھیلانے والے افکار وعقائد کی ترویج کی وجہ سے لوگ بڑی تعداد میں اس گمراہی میں پھنس کر رہ جائیں گے۔ دوسری عبارت میں یوں کہاجاسکتا ہے کہ گذشتہ زمانہ میں سماج کے سیاسی مفکرین اور رہنما وں کو صرف حق وباطل کی شناخت کا خطرہ تھا اور ان کی نگاہوں میں دنیا کے تمام مسائل نوروظلمت ، سعادت وشقاوت یا سفید وسیاہ کے درمیان تقسیم شدہ تھے۔لیکن آج جو چیز موضوع بحث اور باعث تشویش ہے وہ انسانی زندگی کے ماحول اور اس کے اردگرد موجودہ فضا ہے جو سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں رنگ کی حامل نظر آتی ہے۔

پس بازارچہ افکار سے وابستہ استدلال اپنے جملہ مثبت پہلوؤں کے ساتھ Post Modern دور کے تقاضوں کو پورانہیں کرسکتا ہے اور آزادی بیان کے بنیادی نظریہ کا مسئلہ پہلے کی طرح اپنی جگہ پر باقی رہ جاتا ہے اور اس سے جڑے ہوئے قانون کی بات بھی باقی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ تکنیکی ترقیوں اور شعبۂ اطلاع رسانی میں رونما ہونے والی غیر معمولی کامیابیوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اب اس نظریہ کو پہلے سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے کہ شہر کے تمام باشندوں کو اپنے افکاروعقائد کے اظہار کے جملہ امکانات فراہم ہیں اور انہیں مساوی طور پر آزادی بیان کا حق حاصل ہے۔ یہ مفروضہ اب بالکل ختم اور پوری طرح بے معنی ہوچکا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ارتباطی امکانات اب ابلاغ عامہ سے جڑی ہوئی بعض تنظیموں پر منحصر ہوچکے ہیں ۔ چنانچہ ایسا مفکر جس کے پاس دولت وثروت کی کمی ہے یا کسی پارٹی میں بلند مقام ومرتبہ کا حامل نہیں ہے، اپنی بات کو دوسرے لوگوں تک نہیں پہونچا سکتا ہے چاہے اس کی بات استدلال کے قوی ترین اصولوں کے مطابق ہی کیوں نہ ہو اور اس میں ہرممکن خوبیاں بھی پائی جاتی ہوں!

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ابلاغ عامہ سے جڑی ہوئی ان نشریاتی تنظیموں نے آزادی بیان کو سیاسی بیان اور اس کے مختلف مباحث کے دائرہ سے باہر نکال کر تجارت کے میدان میں داخل کرچکی ہیں جس کی وجہ سے یہ موثر اور سودمند تجارت میں تبدیل ہوگئی ہے، جس کا فطری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ آزادی بیان سے مربوط رزمیہ اور روایتی مفاہیم روبہ زوال ہوگئے ہیں اور لوگوں کا ذہن ان جدید

ترین جادوگروں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور صورتحال یہ ہوگئی ہے کہ اس وقت ہم لوگ جو کچھ پڑھتے ، سنتے، دیکھتے اور بحث وتجزیہ کرتے ہیں وہ سب کچھ ان تنظیموں کی ہدایت اور کنٹرول میں انجام پاتا ہے۔ آج ہم لوگ اس مال اور ساز وسامان کے مصرفی کی حیثیت رکھتے ہیں جو ان نشریاتی اداروں سے شائع ہونے والے پروگراموں کے دوران پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر ٹیلیویژن یا انٹرنیٹ پر پیش کئے گئے پروگراموں کے خلاف کوئی چیز لکھی یا پیش کی جاتی ہے تو اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی ہے۔

بازاری نظام ایسے مطالبات کی ایجاد کرتا ہے جو آمادہ مال وساز وسامان پر منحصر ہو۔ ان چیزوں کے زیادہ سے زیادہ استعمال اور ان سے حاصل ہونے والے فائدہ کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور فائدہ کمانا ہی اس کا بنیادی مقصد ہوا کرتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں ہم لوگوں کے افکار وعقائد ''نظام تضارب آراء'' کی بنیاد پر افکار وعقائد کے بازار میں تشکیل نہیں پاتے ہیں بلکہ یہ ان موضوعات پر مشتمل ہوا کرتے ہیں جو بازار کی طرف سے ہم لوگوں کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں جن کا استعمال یقینی ہوا کرتا ہے۔ ہم لوگوں کو یہ امید ہرگز نہ کرنی چاہئے کہ یہ نشریاتی تنظیمیں اس سود مند تجارت سے دستبردار ہوکر ایسے شعبوں میں داخل ہوجائیں گی جہاں معدودے چند روشن فکر اور حاکم نظام کے سیاسی مخالفین کا خطرہ لگا ہوتا ہے جو یہ نہیں چاہتے کہ لوگ فطری راہ وروش پر گامزن رہیں۔

روبرٹ اورماک چسنی نے اپنی کتاب ''دولتمند نشریاتی ادارے اور فقیر جمہوریت'' میں پیداوار سے جڑے ہوئے بازاری نظام کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سابقہ زمانہ میں شہروں میں متعدد رسائل اخبارات شائع ہوا کرتے تھے اور ان اخباروں کے کچھ کالم نوکری اور کاریگری میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لئے مخصوص ہوا کرتے تھے۔ لیکن آج صورت حال بالکل تبدیل ہوچکی ہے۔ آج اخبار اور تجارت دونوں ایک دوسرے کے مترادف مفہوم کے حامل بن چکے ہیں اور تجارتی خبر کو آج سب سے زیادہ اہم اور حقیقی خبر کا درجہ حاصل ہوچکا ہے ۔ وہ موجودہ اخباری روش سے عدم اطمینان ظاہر کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں لکھتے ہیں کہ آخر اس قسم کے اخبار سے کتنے فیصد لوگ متاثر ہونے والے ہیں؟

پس جیسے جیسے آزادی بیان کی حمایت میں قانونی ضمانتوں میں اضافہ ہوتا رہے گا، ان تجارتی

کمپنیوں کے اختیارات اور اقتدار میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا اوراس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ آزادی بیان کے سلسلہ میں جو روایتی قوانین پائے جاتے ہیں ان کا فائدہ بھی انھیں کمپنیوں کو ہوگا۔ پس غور سے دیکھا جائے توبظاہر یہ قوانین تمام لوگوں اورشہریوں کے لئے وضع کئے جاتے ہیں اور قانونی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان قوانین سے تمام لوگوں کو مساوی فائدہ حاصل کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ اب اگر زیادہ تر لوگ اپنے اس حق سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو ان کی آواز خود بخود خاموش ہوکر رہ جاتی ہے۔ اگر سماج کے کچھ لوگ بھی اپنے اس حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آزادی بیان سے کام لیں تو بھی ٹھیک ہے لیکن اگر کوئی سننے والا موجود نہ ہوتو پھراس بات کے کہنے کا کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟

نظریۂ بازارچۂ افکار کا دوسرا مسلمہ یہ ہے کہ مدنی معاشرہ میں مختلف النوع افکار وعقائد کی وجہ سے معاشرہ کی عظمت وبلندی میں اضافہ کے امکانات فراہم ہوجاتے ہیں اورلوگوں کے افکار وعقائد کے درمیان موجود اختلافات اورٹکراؤ کی وجہ سے جموریت کے بنیادی اصولوں کی تقویت بھی ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اطلاع رسانی کی تکنیک میں حاصل شدہ غیرمعمولی ترقی کی وجہ سے سماج کے جملہ معاملات میں سب لوگوں کی شرکت کے بجائے متمدن معاشرہ کے زوا ل کے اسباب فراہم ہونے لگے ہیں۔ اس سماج کے مختلف افراد کے درمیان براہ راست اور روبروتعلقات کے امکانات مفقود ہوکر رہ گئے ہیں۔ ایسے حالات میں افکار وعقائد کے بازار میں مختلف خیالات پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آنے والی ہے۔

اقتصادی وسعت وترقی بھی ان اسباب وعوامل میں سے ایک ہے جن کی وجہ سے ہماری سیاسی باتوں کی اہمیت گھٹتی چلی گئی۔ فقط یہی نہیں بلکہ اقتصادی ترقی کی وجہ سے لوگ اجتماعی شرکت کے بجائے انفرادی اورخصوصی شرکت کو ترجیح دینے لگے۔ جب لوگوں کا زیادہ تر خالی وقت جادوئی پٹارہ کے سامنے ختم ہونے لگتا ہے تو پھر مصرف پسندی کی تبلیغ واشاعت اور وقت گزاری انکا اہم ترین فریضہ بن جاتا ہے ۔ اس کے بعد ان لوگوں کو انٹرنیٹ کی عنکبوتی بارگاہ میں بھی حاضری دینی ہے اوراس 'عبادت خانہ' میں مختلف قسم کے نئے نئے 'معبودوں' کا جلوہ دیکھنا ہے۔ پھر اس کے بعد اتنا بھی وقت باقی نہ رہ جائے گا کہ وہ کسی کی بات سن سکیں۔ ایسے میں معاشرہ کے مختلف معاملات میں ان لوگوں کی عملی شرکت تو محض خواب خیال کی بات بن کر رہ جاتی ہے۔

ان نشریاتی تنظیموں نے عام شہریوں کو سماجی امور میں شرکت سے پوری طرح محروم کررکھا ہے ۔ ٹیلی ویژن سیریل اور تجارتی تبلیغات نے مصرف پسندی کی خوفناک لہروں سے ہم آہنگ ہوکر لوگوں کو عام مباحثات میں شریک ہونے سے محروم کردیا ہے۔ یہاں تک کہ خود ہمارے ملک میں مساجد اور دیگر مذہبی پروگراموں کی عمومی نوعیت بالکل تبدیل ہوکر رہ گئی ہے اور جماعتی صورت میں انجام پانے والے امور خصوصی صورت میں انجام پارہے ہیں اور گھریلو ماحول میں ایسی تبدیلی آگئی ہے کہ خاندان کے مختلف افراد کو ایک دوسرے سے گفتگو کا موقع کم ہی حاصل ہوتا ہے۔

درحقیقت اس طرح کی تفریحات سے اس خطرہ کا احساس ہونے لگا ہے جس کی طرف سماجی علوم کے ماہرین مفکرین نیم صدی پہلے سے برابر اشارہ کرتے چلے آرہے ہیں۔مثلاً آلدوس ہاکسلی نے ''نئی اور نڈر دنیا''عنوان سے ایک ایسا کابوس (Nightmare) آمادہ کیا ہے جس میں حکومتوں کو اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مخالفین کی باتوں پر پابندی عائد کریں یا اسے اس بات میں کوئی دلیل نہیں دکھائی دیتی ہے کہ وہ حقیقت کو پوشیدہ رکھیں اور لوگوں پر عام مذاکرات ومباحثات منعقد کرنے پر پابندی لگادیں کیونکہ لوگ مختلف قسم کے پروگراموں میں اس قدر سرگرم ہوگئے ہیں کہ ان میں ان مباحثات کو سننے اور اس میں شرکت کرنے کا حوصلہ ہی باقی نہیں رہ گیا ہے۔

ہاکسلی کی دنیا میں موجودہ الیکٹرانیکی سرگرمیوں کے درمیان ٹیلی ویژن نے خواہش ، لذت اور لطف اندوزی کی ایک دنیا پیدا کردی ہے ۔ اس دنیا میں حکومت کو صرف اس بات کی فکر وتجسس ہے کہ ہرآدمی کے لئے خصوصی سرگرمی کا اہتمام ہو تاکہ تمام لوگوں کے لئے شادمندی وخوشحالی کا احساس پیدا کیا جاسکے۔ زندگی حیرت اور مسائل کی الجھی ہوئی گتھی کی طرح ہوگئی ہے اور سماج کے بنیادی مسائل کی طرف سے غفلت اور غیرمعمولی لاپرواہی برتی جارہی ہے۔ افکار وعقائد کے بازار کا منصوبہ بنانے والے اس بات کی پیشین گوئی ہرگز نہیں کرسکتے تھے کہ ایک دن آزادی بیان پر مبنی ان کا خیال بیکار اور بے سود ہوکر رہ جائے گا۔ آزادی بیان کی قدروقیمت اس وقت محسوس کی جاسکتی ہے جبکہ سماج میں آزادی فکر پائی جاتی ہو۔ موجودہ زندگی میں لوگ مختلف قسم کی سرگرمیوں میں لگے ہوئے ہیں اور ایسی مصرفی زندگی میں مشغول ہوگئے ہیں کہ انہیں فکر کرنے کی فرصت ہی نہیں مل رہی ہے۔ بلکہ آج ان کی زندگی، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا بلکہ یہ کہا جائے کہ خوراک ہو یا لباس یا دیگر امور زندگی کے ہر شعبہ

میں وہ لوگ مغرب کی بڑی بڑی سرمایہ دارانہ کمپنیوں کی ہدایت ورہنمائی کے سایہ میں جی رہے ہیں۔

آزادی مطبوعات کی حمایت کرنیوالے فقط دو احتمالوں کے سلسلہ میں پیشین گوئی کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ تبلیغ یا پروپگنڈہ یا تو حقیقت پر مبنی ہوگا یا جھوٹ اور بے بنیاد ہوگا۔ یہ لوگ اس بات کی پیشین گوئی نہیں کرسکے جو واقع ہونے والی تھی۔ وسائل ابلاغ عامہ کے میدان میں رونما ہونے والی غیر معمولی ترقی بالخصوص مغربی سرمایہ داری پر مشتمل جمہوریتوں میں نشریاتی وسائل کی پیشرفت میں پیغام کے حق وباطل ہونے سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ غیر واقعی یا کم وبیش غیر مربوط چیزوں سے ربط دے دیاجاتا تھا۔مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے والے لوگوں کو اس بات کا صحیح اندازہ ہوسکتا تھا کہ بیہودہ کاموں میں انسان تقریبا لامحدود حد تک بھوکا ہوا کرتا ہے۔

واشنگٹن میں کئے گئے ایک تحقیقی جائزہ کی رپورٹ کی روشنی میں یہ بات اور زیادہ واضح ہوجائے گی۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ امریکہ گذشتہ تین برسوں سے عراق میں جنگ لڑرہا ہے لیکن دس امریکی نوجوانوں سے جب یہ سوال کیا گیا کہ کیا دنیا کے نقشہ میں وہ عراق کی نشاندہی کرسکتے ہیں تو ان میں سے چھ لوگ عالمی نقشہ میں عراق کی نشاندہی نہیں کرسکے۔

ان امریکی باشندوں کو اپنے ملک کے بارے میں تو بہتر اطلاعات ہیں لیکن ان لوگوں کو کسٹرینا طوفان کے دوران ہونے والے نقصانات کا صحیح اندازہ بھی نہیں ہے۔ ایک سروے کے دوران ایک تہائی امریکی لوگ جن کی عمر ۱۸سال سے ۲۴ سال کے درمیان تھی، Lousiana نامی جگہ کی نشاندہی نہیں کرپائے جبکہ آدھے سے زیادہ امریکی Mississippi کی شناخت نہیں کرسکے۔ یہ سروے قومی جغرافیائی خواندگی مشن کی جانب سے کئے گئے۔ روزنامہ Asian Age کے جناب Rondolph E. schmid کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ اس سروے پروگرام کے تحت دسمبر اور جنوری میں ۵۱۰ لوگوں کا انٹرویو لیا گیا۔ ان میں سے ایک تہائی افراد Lousinia کو امریکی نقشہ میں نہیں ڈھونڈ پائے۔۴۸% فیصد لوگ Mississppi کی نشاندہی سے عاجز رہے۔ دس میں سے تین لوگوں نے یہ کہا کہ خبروں میں جن علاقوں کے نام لئے گئے ہیں ان کے بارے میں معلومات ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح دوتہائی امریکی لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ اکتوبر ۲۰۰۵ عیسوی میں پاکستان میں رونماہونے والے زلزلہ میں ۷۰ ہزار لوگوں کی موت واقع ہوگئی اور دس میں سے ۶ لوگ مغربی ایشیا کے نقشہ میں عراق کی نشاندہی نہیں کرسکے۔صرف اتناہی نہیں بلکہ لاعلمی وناواقفیت کا

یہ عالم ہے کہ اسرائیل فلسطین تنازعہ کا ذکر گذشتہ نصف صدی کے دوران سبھی لوگ سنتے چلے آرہے ہیں، لیکن ۷۵ فیصد امریکی انھیں وسطی ایشیا کے نقشہ پر اسے نہیں تلاش کر سکے۔[۱]

اس رپورٹ کی روشنی میں آزادی بیان کی قلعی کھل جاتی ہے۔ درحقیقت اس سے پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ آزادی بیان کے لئے آزادی فکر ایک لازمی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزاد و پرسکون ماحول میں غوروفکر کے بعد جو بیان سامنے آئے گا اس میں یقیناً انسانی فلاح وبہبود کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ لیکن اگر انسان کی فکر دیگر معاملات میں مشغول ہو اور اس کے پاس لازمی علمی معلومات بھی موجود نہ ہو تو پھر آزادی بیان کا راگ الاپنا بالکل غیر موثر اور بے سود ہوگا۔

نتیجہ کے طور پر یہ بات بالکل واضح ہے کہ بذات خود آزادی بیان کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور یہ مقصود بھی نہیں ہے بلکہ اسے آزاد معاشرہ کی تشکیل کے لئے ایک وسیلہ کی حیثیت حاصل ہے۔ مقصد یہ نہیں کہ جو شخص بات کرنا جانتا ہے وہ کوئی بات کہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ بات کہی جائے جس کا کہنا اہمیت کا حامل ہو۔

چونکہ آزادی افکار وعقائد کو یکساں وسائل اور طریقوں پر مساوی دسترس حاصل نہیں ہے لہٰذا عصری مفکرین اور دانشوروں نے جو ماڈل تیار کیا ہے وہ قابل قبول نہیں ہے کیونکہ وہ بازارچۂ افکار ومعاشرہ کی ترقی وخوشحالی اور کارآمد جمہوریت کے پھلنے پھولنے میں کوئی مدد نہیں کرسکتا ہے۔ اس لئے بھی ہمارا موجودہ سماج درحقیقت ہمارا پسندیدہ سماج نہیں رہ گیا ہے بلکہ یہ ایک صرفی سماج (Consumer's Society) میں بدل چکا ہے جو تولیدات اور ایجادات کے ذوق اور مطالبات کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے، اس میں سیاسی افکار وعقائد کا کوئی خاص کردار نہیں ہے۔

پس آزادی بیان کی حمایت کے لئے قانونی ضمانتیں جس قدر وسیع ہوں گی بالکل اسی اندازہ سے نشریاتی اداروں کے اختیارات اور اقتدار میں بھی پھیلاؤ پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا ان وسیع اختیارات کے مقابلہ میں ایسی موثر اور کارآمد فکر کی جستجو کرنی چاہئے جو عام شہریوں کو احتمالی نقصانات سے محفوظ رکھ سکے اور وہ نامطلوب کلام کی زد میں نہ آسکیں۔

مختصر لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ حالات میں صرف بات کہنے والے کی حمایت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایسی ضمانتوں کی اہم ضرورت محسوس کی جارہی ہے جن کی رو سے نقصان آمیز بیان کے سننے کے بعد جو نقصانات متوقع ہیں ان سے تمام مخاطبین کو محفوظ رکھا جاسکے۔